

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اشارات

[ایک طویل دفعہ کے بعد یہ موقع نصیب ہوا کہ ترجمان القرآن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ادرت میں مرتب ہو۔ چنانچہ مولانا نے اس مرتبہ دو ماہ کی کجائی اشاعت کی ترتیب کا بیشتر کام خود ہی سرانجام دیا لیکن اشارت لکھنے کی تیاری کے دوران ہی میں آپ بیمار پڑ گئے۔ مولانا کی بحالی صحت میں کچھ نہ کچھ وقت لگے گا، لہذا پرچہ کو لیت ہوتے دیکھ کر چاروں ناچار پھر مجھی کو اشارت کے صفحات بھرنے پڑے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو جلد صحت و قوت عطا فرمائے۔ - ن ص]

(۱)

اللہ تعالیٰ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے جو تاریخ پاکستان کے اس عظیم واقعہ پر ہمارے گہرے جذباتی جذبہ سپاس کا مستحق ہو کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ پہلے ضمانت پر عارضی حیثیت سے اور اب ایک سرکاری اعلان کے تحت مستقلاً باز رہنے گئے ہیں۔ راہ حق میں ابتلاء کا وہ بہت آزمائش جو شاہی قلعہ لاہور سے شروع ہوا تھا، پھانسی کی کوٹھڑی اور چودہ سال قید با مشقت کے پربینچ مراحل کو پچاس ماہ کے عرصے میں عبور کر کے لے لیکن یہ امر بڑا افسوسناک ہے کہ مولانا مودودی، مولانا عبد الستار خاں نیازی اور چار مزید امیران مارشل لا کی بقیہ مدت قید کو ختم کرنے کا اعلان اپنی حدود و ظرف میں بقیہ چند امیران کو دے سکا۔ چاہیے کہ حکومت اب ان سب کو رہا کر دے۔ بلکہ مولانا اصلاحی کے مشورے کے مطابق مزید فیاضی سے کام لے کر راولپنڈی سازش کے قیدیوں اور دوسرے سیاسی ایسروں کو رہا کر کے اپنے حق میں نضا کو خراب ہونے سے بچائے۔

بغیر و خوبی تمام ہو چکا ہے۔

طے شود حسب اوہ عدد سالہ بہ آہے گا ہے!

جرم دیکھیے تو "قادیانی مسئلہ" جیسا سنجیدہ علمی پمفلٹ لکھنے کا جرم جو عام قانون ملکی کے تقاضوں سے کوئی منافات نہیں رکھتا، اس پر فوجی عدالت میں مقدمہ کی سرسری اور عاجلانہ سماعت، پھر دنیا کی انتہائی سزا دینے کا فیصلہ اور بعد میں اس کا عمر قید میں بدلانا، پھر ملکی عدلیہ کے سامنے اپیل کے حق کا سبب کیا جانا اور انڈینٹی آرڈینیٹس کے ذریعے اس سزا پر گورنر جنرل کا قانونی مہر ثبت کر دینا، پھر دستور یہ کہ اس آرڈینیٹس کی توثیق کر کے اسے مستقل ایکٹ بنا دینا، پھر کم سے کم تین سال کی سزا کی حد تک فیڈرل کورٹ کے کسی نامعلوم بیج کی رائے کا حصول اور اسے دیر تک مخفی رکھا جانا، اور پھر اس خاص قیدی کے لیے ایام معافگی کے حق کا ایک بڑا حصہ روکا جانا، یہ پورا سلسلہ احوال گواہ ہے کہ مولانا مودودی پر کس غم و ساتھ عنایت خاص فرمائی جا رہی تھی۔ دوسری طرف دیکھیے کہ مولانا مودودی کی رہائی کے لیے عوام کی سسل اور ملک گیر بیخ پکار کا جواب کس شانِ تغافل سے دیا جاتا رہا، ممتاز شہریوں کے وغیرہ کے سامنے مرکزی وزراء کس اسلوب سے کوئی روک ٹوک جواب دینے سے گریز فرماتے رہے، پھر پنجاب اسمبلی میں اکثریت کے رجحان (اور مطالبہ رہائی پر بہت سے متاثر ارکان کے دستخط کرنے) کے باوجود کس پراسرار تدبیر سے ریزولوشن پاس ہونے کو روکا گیا، پھر ملک نوں نے کس تحدی سے فرمایا تھا کہ میری حکومت مولانا مودودی کی رہائی کی سفارش کرنے پر تیار نہیں۔ پھر یاد کیجیے سرکار کے اس مزاج شناس اخبار نویس کو جس نے اس سلسلے میں ایک محض نام پر دستخط کر کے عوام کا ساتھ دینے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ اندیشہ خیز حالات کون اس بات کا متوقع ہو سکتا تھا کہ ۸ مارچ پر پیل کو دیکھا گیا مولانا جیل سے باہر ہوں گے۔

لیکن جن لوگوں کو یہ یقین تھا کہ اس سلطنتِ کائنات کا ایک فرماں روا اور انسانی تاریخ کے واقعات و حوادث کا منصوبہ ساز موجود ہے، جن کے دلوں میں یہ ایمان موجود تھا کہ وہ فرماں روا اور منصوبہ ساز ہستی با اختیار بھی ہے اور اپنے سرکش تری بندوں پر اس کا حکم اسی طرح ہے روک ٹوک چیل ہے جس طرح زمین

پر رینگنے والی سپرنٹیوں پر چلتا ہے اور جن کے دلوں میں یہ اعتماد ہر قسم کے حالات میں کا فرما رہا ہے کہ وہ اپنے نام لیواؤں اور اپنے دین کے خادموں کا نگہبان ہے اور ان کے خلاف چلی جانے والی چالوں کا توڑ کرنے کے لیے اپنی بے پایاں نکت و طاقت کے ساتھ خود منزل بہ منزل ان کے ساتھ موجود رہتا ہے۔ ان کے سینوں میں شمع امید باد مخالفت کے تازے تند جھونکوں کے سامنے بھی کبھی ٹھل نہیں ہوتی۔ وہ برائے منتظر رہتے ہیں کہ جب امر الہی کی کلید رکاوٹوں کے تالے کھولنے کے لیے حرکت میں آجائے گی تو اس کلید کی گردش میں کوئی مزاحم نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ مولانا مودودی کی اچانک رہائی نے ایسے لوگوں کو آج اپنے خدا کے واسطے پر ایک نئے ایمان و اعتماد سے مالا مال کر دیا ہے۔ و نورا دقہرا یما نا۔

کل اس ملک اور اس ملک سے باہر کے جن ہزاروں لاکھوں افراد کے دل مولانا مودودی کے لیے تڑپتے موت کا اعلان سن کر تڑپ اُٹھے تھے، پھر وہ دل جو مولانا مودودی کی قید کی ایک ایک گھڑی پر چسپنی اور اضطراب کے ساتھ دھڑکتے رہتے ہیں، وہ کہ جنہوں نے عظیم کے خلاف تمام ممکن جمہوری تدابیر صدائے احتجاج بلند کرنے کا حق ادایا ہے، آج وہ ایک نئی خدا اور سرت سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں۔ جن آنکھوں میں کل آفسوئیر تیر گئے تھے آج ان کی پتلیوں سے ایک بے پایاں خوشی اُٹھتی دکھائی دیتی ہے۔ کل جن کے لیے غم تھا آج ان کے لیے کیرت ہے۔ اور قانون قدرت ہی ہے کہ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا یُکْرِتُ تَارِیْخَ کَامَسْمُوْلٍ یَّیْ ہِیَہُ کَ اَرَامٍ وَّرَاسِتٍ کَ اَمَلٍ مَّیْمِیْہُ مَشَقَّتِ کَ اُیُوْدٍ وَّرَکَّابِہِ۔ کسی مقصد کے لیے جو جس درجے کی تکلیف سے گزر رہا ہے اس کو اسی درجے کی طمانیت جو اب میں دی جاتی ہے۔

فالحمد للہ علی ذلک۔

آخر مولانا مودودی میں وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے اس کی قید اور اس کی رہائی سے ان گنت لوگ دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ کوئی فرشتہ یا کوئی فوق البشر ہستی نہیں بلکہ انسان ہے اور اسی طرح کا خان انسان ہے جیسے ہم سب ہیں۔ وہ کسی مقدم خاص کا مدعی نہیں، اپنے آپ کو محض استیغاب کے ایک عاقل فرد کی حیثیت میں پیش کرتا ہے۔ وہ پیری کی مسند چھپا کر نہیں بیٹھا بلکہ عام آدمیوں کی طرف رہتا رہتا ہے

اور عام آدمیوں سے ملتا جلتا ہے۔ وہ اپنے لیے خصوصی امتیازات اور القاب و آداب نہیں چاہتا بلکہ کئی تعطف و تفضیح کے بغیر ہر قسم کے لوگ اہل سے معاملات رکھتے ہیں۔ وہ کرامات اور شہدے دکھا کر اور خواب اور کشف بیان کر کے کسی کو مسحور نہیں کرتا بلکہ سیدھے سیدھے استدلال سے بات کہتا اور بات کا جواب دیتا ہے۔ اس کے پاس ملک کا کوئی انتظامی و وزارتی منصب نہیں ہے کہ وہ اس کے ذریعے لوگوں پر دعوتیں جاتا ہو۔ اس کے قبضے میں کوئی ایسا اختیار نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے نام الاٹ ٹھٹھیں کر کر کے، دہاڑی برآمدی لائسنس بانٹ بانٹ کر، پاسپورٹ دے دے کر، ان کی سفارشوں پر ان کے کام بنا کر، یا ان کی آزادیوں اور ان کی عزتوں پر پھاپے مار مار کر ان کو اپنا حمایتی اور قصیدہ خواں بنا کر، وہ جن سازش میں ٹولی دک نہیں رکھتا کہ لوگوں کو شریکانہ بخوبی کے ذریعے باہم دگر توڑ توڑ کر اپنے اثر و رسوخ کا راستہ نکالے۔ یہ سب کچھ نہیں ہے تو پھر وہ کیا چیز ہے جس نے مولانا مودودی کو ایک نمایاں بیت دے دی ہے۔

ایک متابع ایمان! ایک نورِ علم! ایک دعوتِ حق! ایک نظریہٴ ماحول! ایک پائیزہٴ مقصد و نصب العین!
 ایک نقشہٴ تعمیر! ایک جذبہٴ خدمت! ایک متابعِ کردار! بس یہی کچھ ہے ساقیِ متابعِ فقیر!
 یہی جوہر ہے جو ایک طرف ہزار یا لوگوں کے لیے مولانا مودودی کی ذات کو انتہائی محبوب بنانے والا ہے اور دوسری طرف یہی وہ جوہر ہے جس کی امانت داری کا قصور اسے بہت سی ہستیوں کی نگاہوں میں انتہائی مسخوف ٹھہرانے والا ہے۔ ایک طرف سے اس کے سامنے بہترین انسانی جذبات، اخلاص، پیش کیے جاتے ہیں، دوسری طرف سے بدترین گالیوں اور الزامات سے اس کو نوازا جاتا ہے۔ جہاں یہ حقیقت ہے کہ قوم کی ایک بڑی اکثریت اس شخص کی رہائی پر اللہ تعالیٰ کے سامنے شکرگزار ہی کے جذبات نذر کر رہی ہے وہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ کچھ عناصر کے لیے بڑا ہی المناک حادثہ ہے جو ۲۸ اپریل کو اس ملک میں رونما ہوا۔ وہ لوگ ہی ہیں جو امامتِ دین، اسلامی دستور کے نفاذ، قوم کی ذہنی و اخلاقی تعمیر اور ملک کے انتظام کی جدوجہد میں ذہنی، جسمانی اور مالی تعاون اس کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور ان کے بالمقابل وہ لوگ بھی ہیں جو مولانا مودودی کے راستے میں روڑے اٹھاتے، اور اس کے کام کو آسمان پہنچانے اور راستے عام

کو اس کے اثر سے بچانے کو زندگی کا اہل مشن بنا کر ہر ممکن تدبیر عمل میں لا رہے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں مولانا مودودی کے لیے اچھے جذبات رکھنے والے خواص و عوام کو محسوس کرنا چاہیے کہ آج جبکہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مودودی ۲۵ ماہ کی جبری جدائی کے بعد پھر آپ سے آٹھ میں تو مولانا کی ذات سے عقیدتوں اور دلچسپیوں کا اظہار کوئی معنی نہیں رکھتا۔ سوال تو یہ ہے کہ عکس و عمل کی اس فیصلہ کن مہم میں آپ کیا حصہ لیتے ہیں جو مولانا مودودی کے ہاتھوں آغاز پاکر اب ایک منظم تحریک کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ حالات نے ایک بڑی نازک آزمائشی صورت ساری قوم کے لیے پیدا کر دی ہے جبکہ ایک طاقت و عورت امامت وین کو چلتا پھرتا دیکھنا چاہتی ہے اور ایک دوسری طاقت اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے درپے ہے۔ قوم کی قسمت۔ اور خود آپ کی قسمت۔ ان دو گونہ رجحانات کے درمیان معلق ہے۔ ایسی نازک پوزیشن کے پیدا ہو جانے پر اسلام پر ایمان رکھتے ہوئے آپ کا غیر جانب دار تماشائی بن کر بیٹھے رہنا درحقیقت مخالفین وین رجحانات کے ہاتھ مضبوط کرنے کے ہم معنی ہے۔ اس کو تاہی کی تلافی کسی خادم دین و ملت کی ذات سے مجرد ذہنی وابستگی رکھنے، اس کے کام پر داد دے دینے اور اس کا پرجوش استقبال کرنے اور اس کے گلے میں پھولوں کے ہاڑیاں دینے سے نہیں ہو سکتی۔ آگے بڑھیے۔ حالات کے آثار پڑھاؤ میں کوئی معمولی پارٹ ادا کیجیے !!

(۲)

سلسلہ کے اخیر میں حالات کے چرخے نے اچانک جو لٹری گردش شروع کی تھی اس کے ہر پھیرنے میں نئے نئے واقعات و حوادث سے دوچار کیا ہے۔ اس دوران میں حالات کے ارتقاء کا کوئی اصولی رشتہ باقی نہیں رہا۔ تغیرات کی کوئی سمت سفر متعین نہیں رہ گئی، سیاست کا جہانہ ننگر اور باوبان دونوں سے محروم ہو چکا ہے، سیاست قی کے کسی گوشے۔ دستوری مرتبے، پارلیمنٹری بنیاد، قانونی انصاف

داخلہ و خارجہ پالیسی — میں حالت استقلال (STABILITY) دکھائی نہیں دیتی حیات ملی کی ساری کی ساری متاع اس وقت ہوا کے رخ بدلتے جھونکوں کے حوصلے ہو چکی ہے۔ میدان کا زوئی کے بڑے بڑے شہسوار تک کا حال یہ ہو گیا ہے کہ "نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پاسے رکاب میں"۔

تغیر قومی زندگی میں عین شے مطلوب ہے کیونکہ ترقی اور ترقی و صلاح اس کے بغیر ممکن نہیں لیکن بد قسمت ہوتی ہے وہ قوم جس کے ہاں آنے کو تو تغیر ہر صبح اور ہر شام آ رہا ہو لیکن اٹا ہر بار وہ نئی پستیوں نئی نامرادیوں، نئی پسپائیوں اور نئی پیچیدگیوں اور پریشانیوں کے سیلاب جلو میں ایسے وارد ہو۔ انوس کہ ہمارے ہاں پچھلے دنوں سے حدوت و تغیر کا جو دور شروع ہوا ہے وہ اجتماعی اراذلوں اور عوامی رجحانات اور قومی تقاضوں کی طلب کے تحت نہیں، بلکہ ان کے بالکل خلاف اور ان کے بالکل علی الرغم آیا ہے اور اس شان سے آیا ہے کہ اس نے آزادی کے مرتبے، جمہوری ریایات، شہری حقوق، سیاسی اخلاق، ملی معاصد، دستوری تدوین، انتظامی ڈھانچے، دستری نظم و نسق، سب کو ہلاک کے چھوٹا ہے۔ اس نے وہ بندھن ڈھیلے کر دیئے ہیں جن سے کسی قوم کی کتاب حیات کا شیرازہ بندھا رہتا ہے، اس نے وہ روابط توڑ ڈالے ہیں جو معاشرہ کے مختلف شعبوں و احوال کو اس کے ماضی اور مستقبل کے درمیان باجم و گرجہ کے سکتے ہیں اور اس نے وہ بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں جن پر کسی قوم کی بین الاقوامی عزت اور سادھ کھڑی ہوتی ہے۔

تاریخ پاکستان کا یہ دور زلزل جو ہمارے سامنے ہے، اس کے منہور اور اس کے نشو و ارتقا میں ہر ایک کا کچھ نہ کچھ حصہ ہے۔ اس میں ایک پارٹ مسلم لیگ اور اس کی اصول و کردار سے محروم تیادت کا ہے، اس میں ایک پارٹ بغیر کسی اجتماعی نصب العین کے محض حصول اقتدار کی کشمکش میں حصہ لینے والی متفرق سیاسی ٹولییوں کا ہے۔ اس میں ایک پارٹ ابن الوقت قسم کی صحافت کا ہے۔ اس میں ایک پارٹ جامہ مذہبیت اور حنے وائے دنیا طلب حضرات کا ہے۔ اس میں ایک پارٹ اُن لوگوں کا ہے جن کو محض اتفاقات زمانہ سے اقتدار حاصل ہو گیا ہے، اس میں ایک پارٹ مستقل ملازمتوں کے اونچے طبقے کا ہے، اس میں ایک پارٹ تارن کے نمائندوں کا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں ایک پارٹ — اور بہت بڑا پارٹ — خود عوام کا ہے۔ یہ سب کے سب اپنے درجے اور

اپنے اپنے عمل کے مطابق اس تقدیر کے بنانے میں حصہ دار اور ذمہ دار ہیں جس سے آج ملک دوچار ہے اور جس کے برگ و بار خود ان حصہ داروں اور ان کی نسلوں کی اپنی مجبوریوں ہی میں پڑنے والے ہیں۔

ہم یہاں ان حالات کا کوئی جامع تجزیہ تو نہیں کرنا چاہتے، البتہ ان کے چند عبرتناک پہلوؤں کو ضرور نمایاں کر کے دکھانا چاہتے ہیں۔ ایک امر واقعہ تو یہ ہے کہ اپنے آپ کو قوت و اختیار کے آخری آمرانہ مراتب پر فائز ہوتے دیکھ کر ہمارے بزرگوں نے جو فولادی غرام بانڈ سے تھے ان کو حالات کی ٹھوکروں نے بالکل چوڑا ہوں پر اس طرح چکنا چور کیا ہے جیسے وہ کاپر کی چوڑیاں ہوں۔ دنیا نے دیکھا کہ ان غرام میں بار بار کس طرح تراجم ہوتی چلی گئیں۔ اور دنیا دیکھ لے گی کہ مستقبل کے لیے جو آہنی ارادے آج پیش کیے جا رہے ہیں ان کا حشر بھی یہی ہو کے رہے گا۔ پھر عبرت اندوز ہونے کا دور سرا پہلو یہ ہے کہ اس غیر صحت مندانہ ماحول میں عہدے کی کسی کرسی کی طرف جو کوئی بھی لپکا ہے وہ کیسے کیسے وعدے کرے اور کیسے کیسے بھروسے دلا کر لپکا ہے، لیکن کرسی پر جا کر بیٹھتے ہی ان دعووں اور بھروسوں سمیت برسوں کے قائم شدہ نظریات اور دعووں اور مطالبوں کی آٹا نانا ایسی لاجواب نکالیا گیا کہ سمجھتی ہے کہ ان حضرات کے بالکل ناجائز عقیدت مندوں کی بھی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ مدتوں سے بنے ہوئے سیاسی کردار جو قومی خدمات، جدوجہد آزادی اور قید و بند کی قربانیوں کے نہرے تلے زریب قیام کیے ہوئے تھے ان کا طبع! قدرتی کوٹھالی میں پہلی آبیچ کھاتے ہی کس بُری طرح اُترا ہے۔ پھر سبق حاصل کرنے کے لیے تیسرا قابل مطالعہ پہلو یہ ہے کہ کیسے بھانت بھانت کے لوگ — جن کے درمیان کسی سیاسی جوڑیل کا کوئی امکان عقلی موجود نہ تھا — تقدیر کے عطا کردہ موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک ہی خواہش یعنی جمع ہو گئے اور کمال یہ کہ جن زبانوں نے کل تک اپنے کچھ حرفیوں کو غداری سے کم درجے کے کسی لفظ سے مخاطب نہیں کیا تھا وہ انہی کو خروش آمیز کہنے پر مجبور ہوئیں۔ لیکن دوسری طرف اس مصنوعی اتحاد کا ایک یہ پہلو بھی توجہ طلب ہے کہ دونوں پر وہ بھی ان اتحادیوں کے درمیان جیب سے اب تک برابر چاہیں چلی جا رہی ہیں اور ہر مہر عام بھی ہر ایک نے اپنی اپنی ذہنی بھائی سے اور اپنا اپنا راگ ستایا ہے۔

پھر جو گونا گوں بول بولے جلتے رہے ہیں ان میں سے کسی ایک کی عمر نے وفا نہ کی۔ بلکہ بڑے سے بڑے بول کا سکہ بھی سبتہ دو سبتہ، ہینہ دو ہینہ چل کر کھوٹا ہو گیا۔ ایک ایک کی بھی ہوتی باتوں کو اخبارات سے نکال کے نمبر وار نوٹ کیجیے اور پھر خود ہی معلوم کیجیے کہ کونسی بات کے من چلی! چوتھا پہلو جس کا جائزہ لے کر غائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ معاہدہ کٹ کٹش بڑی تیزی سے اکابر کے طبقہ کا باہمی اختلاف ختم کیے دے رہی ہے۔ اس کٹ کٹش کی موج جب اٹھتی ہے تو بھی ۱۹۲ کا وار کے بھی جہانی اسمبلی کی لکھاڑ کے پسے چینک دیتی ہے اور کبھی مرکز کے اشارے کے تحت کسی صوبائی وزارت کا تخت الٹ دیتی ہے۔ سندھ کے بعد اس کی ایک تازہ سنہری مثل وزارت پنجاب کی اکھڑ پچھاڑ کا غیر متوقع واقعہ ہے۔ پھر یہ عبرت ناک منظر دیکھیے کہ اس طرح کی شاہانہ بہروں کا عمل بڑو بڑو کے واقعہ ہوتا ہے تو چھوٹے چھوٹے لیڈر، صحافی اور ایم ایل اے حضرات کرسی پر آ بیٹھنے دے صاحب منصب کے ملنے قصیدے اور سپانسامے پیش کرنے لگتے ہیں اور کرسی سے اترنے والے کے خلاف جو گوئی کا ایک طوفان کھڑا کرتے ہیں۔ ورنہ ایک کل تک وہ اس کے قصیدے کہنے میں طلب اللسان رہ چکے۔ اور اس راتوں رات کی طلب مابیت کی اصل حقیقت پر وہ کوئی پروہ بھی نہیں ڈال سکتے۔ اخلاق کی اونچی ترین سطح سے بھی گرا ہوا یہ سیاسی کردار حکومتی تغیرات کے نمودار ہونے پر نہایت غیر شریعہ فضا پیدا کر دیتا ہے۔ طرز یہ کہ سیاسی پارٹیاں — مع حکومت پر نائز ہونے والی متعلقہ پارٹی کے — منہ میں گھنٹھنیاں ڈالے پڑی رہتی ہیں، جیسے یہ ان کا سر سے سے موضوع تو جو یہی نہیں! ان حالات میں یہ بالکل واضح ہے کہ کسی کے پائوں کے نیچے مضبوط زمین اب نہیں ہے۔ اب تو ایوان جاہ و منصب بالکل کارواں سرائے کی صورت اختیار کر گیا ہے کہ مسافر نے رات گزار ہی، سوچ کو کوچ!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تثلیث الہی نے ہر گروہ اور ہر فرد کی حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ قدرت کے ہاتھ نے تمام قابل ذکر عناصر اور ان کے اندر کی متاز شخصیتوں کو دور قدرت سے تین تین کر چھین کر لیا ہے اور اب ایک ایک جہتی کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر اسے اسٹیج پر لایا جا رہا ہے

اور اسے مجبور کیا یا دین ہے کہ فکر و عمل اور ذہن و کردار کا جو کچھ سر پر یا یہ تو ہمارے پاس ہے اسے سب کے سامنے کھول کر رکھ دو۔ اپنی صلاحیتوں کو گن گن کر اور ماپ کر اور تول کر بھرنی نہیں میں خود تباہ و کفر کیا ہوا اور کیا نہیں ہو۔ مخالف مشیت سے ہماری نفساں کے ایک ایک سکے کو جانچنے کے لیے سر بازار پر کسوٹیاں نسب کر دی ہیں اور کٹھنیاں آگ پر چڑھا دی ہیں۔ بالکل بیچ کھیت میزان گئی ہے اور انہوں نے اعمال نئے رہنے ہیں۔ دکھائی یہی دیتا ہے کہ اب کسی کا پر وہ نہ رہے گا اور سارے بھرم کھل جائیں گے۔ تو تم جس جس کے بارے میں کسی دھوکے میں تھی اور جس جس سے وہ امیدیں وابستہ کر سکتی تھی اب ایسے لوگوں کے ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن بھی لوگوں کی سر کی آنکھوں کے سامنے ناشر کیا جانے لگا ہے۔ یہ طرزِ معاملہ قدرت ہمیشہ ایسے عناصر کے ساتھ کرتی ہے جن کی مہلت کار کے دن پر سے ہو چکے ہیں۔

یہ مرحلہ بڑا سنگین اور دل ہلا دینے والا مرحلہ ہے، لیکن غالباً اس میں خیر کا سب سے بڑا پہلو یہی ہے کہ پاکستان کے عوام کو خوش فہمیوں اور من گھڑتوں اور دم دلا سوں کی تاریکی سے نکالی کر حقیقت کے اجاگرے میں لایا جا رہا ہے جہاں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یہ فیصلہ کر سکیں کہ کون ان کی بگڑی بنانے میں ان کے کام آسکتا ہے اور کس کے ہاتھوں جو کچھ بن چکا ہے اس کے بھی تباہ ہو جانے کا خطرہ ہے! اس تمام محبت کے بعد عوام اپنا مستقبل اور اپنا انجام تجویز کرنے کے خود ہی ذمہ دار ہونگے!

(۳)

یہ سوال بڑا قابل غور ہے کہ یہ جو کچھ پیش آیا ہے تو تم نے کبھی نہیں چاہا کہ وہ ایسے حالات سے دوچار ہو۔ بخلاف اس کے لوگوں نے ہمیشہ اپنے ملک اور اپنی ریاست کے لیے اپنے مستقبل کا تصور بنا رکھا ہے۔ ان حالات کے پیش آ جانے پر بھی کوئی ان سے خوش نہیں اور کوئی ان پر مطمئن نہیں۔ بلکہ ہر شہری کو ان کی وجہ سے افسوس و غم لگتا ہے اور کچھ نچ ان سے گجاست پانا چاہتا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ نہیں ہوتا اور جو کچھ ہم نہیں چاہتے وہی ہوتا ہے؟ اور جب یہ حالت ہے

تو یارسی کے گڑھے میں گر کر قومی خود کشی کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ کار باقی ہے ؟
 بات یہ ہے کہ چاہنے کو فرد ہو یا قوم ہر کوئی ہمیشہ اپنا بھلا ہی چاہتا ہے۔ آرزوئیں ہمیشہ اپنی
 ہی بانڈھی جاتی ہیں، مجبور پٹرول میں رہنے والے بھی خواب ہمیشہ محلوں کے دیکھتے ہیں۔ ہم پاکستانیوں
 نے بھی سر قریوں اور تناؤوں کی مدد سے یہی چاہا ہے کہ ہم دنیا کی عظیم ترین قوموں میں سے ایک ہوں،
 ہماری ریاست ایک ترقی پذیر اور خوشحال ریاست ہو، ہماری ٹی آئیڈیالوجی ہمارے ہاتھوں جاہل
 عمل پہنچے، اسلامی دستور بنے اور قرآن و سنت کی اساس پر ہمارا محبوب نظام خیر و برکت کار فرما ہو
 اعلیٰ درجے کی جمہوری نظام بنایا جائے جو جس میں ہمارے شہری حقوق محفوظ ہوں، معاشی استحصال
 کا خاتمہ ہو جائے۔ ہمارا انفرادی و اجتماعی کیرئرساری دنیا کے لیے ایک نمونہ و مثال کا کام دینے
 والا ہو۔ ہمارا نظم و نسق خیانت، رشوت اور بے قاعدگیوں سے پاک ہو جائے، ہمارے
 اوپر لاگ قانون کی عملداری ہو اور کوئی طاقت دستور کی حدود سے تجاوز نہ کر سکے۔ ہمارا بچپن اپنا
 کشمیر ہم سے آئے، ہمارے ہمارے بھائی مکمل طور پر بحالی کی منزل کو پہنچ جائیں اور بہترین باسول
 اور جدید قیادت ہماری زمام کار ہاتھ میں لے۔

مگر مجردان اپنی اپنی باتوں کو چاہتے اور ان کی فہرست، گفتگوؤں، تقریروں اور تحریروں میں
 گنوتے رہنے سے ہزار برس میں بھی کوئی نتیجہ مطلوب برآمد نہیں ہو سکتا۔ قومی خواہشوں اور تناؤوں
 اور امداد کے برائے کی کچھ شرائط ہیں۔ تو میں انہی کے بل پر جو کوئی ان شرائط کو پورا کر دیتا ہے
 اس کی آرزوئیں پھلتی پھرتی ہیں اور جو کوئی محض پڑے پڑے شیخ ہئی کے سے خواب دیکھتا رہتا
 ہے وہ جب آنکھیں کھولتا ہے تو اس کے تعمیر کردہ شیش محل چکنا چمد ہو جاتے ہیں۔

تو وہ شرائط کیا ہیں ؟

قومی تناؤوں کے بارے میں ہونے کی شرائط اول یہ ہے کہ گونا گوں متفرق خواہشوں اور تناؤوں اور
 فردوں کو کسی ایک اصولی و تعمیری نصب العین کی شکل میں ڈسالا جلانے۔ انسانی معاشرہ جوں کے

زندہ رہنے اور ترقی کرنے، مشکلات پر قابو پانے اور بہترین مستقبل حاصل کرنے کا یہ ایک ناگزیر تقاضا ہے کہ وہ ایک جامع و ہمہ گیر نصب العین اختیار کریں اور فرد و قوم کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جائیں۔ اس منصب العین کے لیے ایک گہری محبت اور اس کی طرف بڑھتے چلے جانے کے لیے ایک تمام دلوں پر طرف کار فرما ہو کوئی رکاوٹ قوم اور اس کے نصب العین کے درمیان حائل ہو نہ چاہے۔ وہ کوئی غیر ملکی طاقت ہو، چاہے کسی طاقت کا مفاد ہو، چاہے وہ کسی صاحب منصب کا اقتدار ہو، چاہے وہ کوئی دستوری تقاضا ہو، اسے راستے سے ہٹا پھینکنے کے لیے اس سرے سے اس سرے تک بے چینی کی لہر دوڑ جائے۔

یہ اللہ کا احسان ہے کہ ہم بے خبرگی کھائی قوم نہیں ہیں بلکہ ہماری ایک مضبوط آئیڈیالوجی ہے اور وہ آئیڈیالوجی ہیں ایک ایسا تمیزی نصب العین دیتی ہے جو ہماری ساری متفرق خصوصیات اور تنازوں کا جامع ہے۔ اس کو متہائے نظر بنا کر ہم اگر متحدہ اقدام کریں تو ہم دنیا میں نہ صرف یہ کہ ایک آزاد، خوددار اور ترقی کرنے والی مضبوط قوم اور سلطنت کا سامنا پیدا کر سکتے ہیں بلکہ امید گاہ عالم اور مرکز انسانیت ہونے کا گم شدہ منصب دوبارہ ہاتھ آ سکتا ہے۔

بد قسمی یہ ہے کہ ہمارا ایک قابل عنصر اٹھری چوٹی کا زور اس بات پر لگا رہا ہے کہ قوم کسی طرح اسلامی نصب العین کو عملاً اختیار نہ کرنے پائے۔ پھر اس سے نیچے آ کر ہمارے خوش حال طبقوں میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کو اپنی نوکری اور خزاہ، اپنی تجارت اور اپنے پیشہ، اپنے سوشل انٹیکس اور اپنی تفریبات سے آگے قوم نہ چلے بسے۔ اسے کوئی دوسری نہیں اور وہ بالکل غیر جانب دار غیر متعلق ٹیپے لیکن ہیں۔ پھر ہمارے تعلیم یافتہ اور ان پر عوام کی بہت بڑی تعداد ہے جو اسلام اور اسلامی دستور اور اسلامی نظام حیات کے لیے ایک گورنر دوسری تو رکھتی ہے لیکن وہی بس حسرت و آرزوی متذکر، اسے دل و جان سے اپنا محبوب نصب العین بنا کر متحرک نہیں ہے۔ آخر میں وہ حساس اور ذمہ دار عناصر ہمارے سامنے آتے ہیں جو اسلامی نصب العین کو واقعی نصب العین بنا کر اپنے حصے کا فرض ادا کر رہے ہیں ہم سوچو کہ ہمارے کارآمدات کی خطرناکیوں کا واسطہ ہلا کر ملک کے ایک فرد سے اپیل کرتے ہیں کہ متفرق خیالی تنازوں کی سطح سے اوپر اٹھیں اور اسلامی — یا کوئی — تمیزی نصب العین

اختیار کریں۔ خواہ کسی کے پیش کردہ نصب العین پر جمع ہوں۔ خواہ اپنے نصب العین پر دوسروں کو جمع کریں۔ یہ بے نصب العین کی پریشان حال زندگی اب ختم ہو جانی چاہیے۔ سامنے نصب العین نہ ہو تو تو میں چیز ٹھیکوں جیسی کثیر تعداد میں ہو کر بھی بے تغیر پڑی رہتی ہیں، اور تغیر ان پر آتا بھی ہے تو اور زیادہ پستی اور تباہی میں دھکیل دینے کے لیے آتا ہے۔

قوموں کی آزادی، ریاستوں کی ترقی اور معاشرہ کے استحکام کے لیے دو مہم اہم لازمہ تنظیم ہے۔ سیاست اجتماعی کا یہ اتنا بڑا تقاضا ہے کہ علمائے سیاست نے ریاست کے عناصر غمخس میں اسے شمار کیا ہے۔ جس انسانی آبادی میں تعاون، ائتلاف، یکجہتی، ہم آہنگی اور تنظیم کے داعیات کا فرہانہ ہوں وہ اول تو ریاست کے مرتبے پر آ نہیں سکتی اور اگر نجات و اتفاق سے اسے اٹھا کر تخت آزادی پر بٹھا بھی دیا ہو تو وہ کسی لمحے تخت پر سے اچانک گرے گی اور سیدھی غلامی کی گود میں جا پہنچے گی۔ اس کو غلام بنانے کے لیے باہر کی کوئی قوت قاہرہ اگر نہ بھی متوجہ ہو تو اس کے اندر سے اس کے اپنے ہی فرزند اٹھیں گے اور اس کے سر سے تاج اقتدار، اس کے کندھوں سے شاہی تباہ اس کے ہاتھوں سے عصائے سلطنت۔ اور اس کے قلمدان سے مہر فرماں روائی دیکھتے دیکھتے اچک میں گئے اور اس ساری تباہ گراں بہا کو بیچ بٹا کر کھاپی جائیں گے۔ ایک غیر منظم قوم کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کی آزادی پر ہاتھ صاف کرنے والی اندرونی طاقتیں جب اٹھ کھڑی ہوتی ہیں تو وہ خنجر کی دیل سے بات کرتی ہیں، وہ تشدد کے قانون سے قسموں کا فیصلہ کرتی ہیں، وہ سازش کے ذریعے بڑیں پھیلاتی ہیں اور کسی کو آف کرنے کا موقع نہیں دیتیں۔ کروڑوں افراد کا غیر منظم انبوہ یہ سب کچھ ہوتا دیکھتا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ منتشر افراد سیاسی حیثیت سے کوئی وقعت نہیں رکھتے، وہ محض بھڑکریاں ہوتے ہیں۔ پڑھی لکھی اور ڈگریاں رکھنے والی بھڑکریاں، فلسفی اور سیاست دان بھڑکریاں، سوٹ بٹ اور شیر وانی پاجاموں میں ملبوس بھڑکریاں! بڑے سے بڑے انبوہ کو مستعدان کے لیے یہ کافی ہے کہ کوئی بھی زید، عمر، بکر امرتیب کا لٹہ کندھے پر رکھے نمودار ہو اور ان چوپان بن کر ان کو بدھ چاہتے ہانک لے۔ وہ فرسے سے ان کا دودھ

پیشہ، ان کا گوشت کھائے، ان کی اُذن سے قالین بنوائے اور ان کو اور ان کے بچوں کو قصابوں کے ہاتھ پتہ پارہے، بلیٹر بکریوں سے بغیر اس کے کیا ترقی کی جاسکتی ہے کہ جو بلی کسی نہ کسی طرح ان کا چہرہ دیکھیں گے۔
ہم وہ اسی کے آگے تھو تھنی ٹکا کر مینا دیں۔

امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس، چین، انڈیا اور دوسری قومیں اگر ترقی کرتی ہوئی زندہ قومیں ہیں تو محض اس لیے کہ ان کی آبادیاں پارٹیوں کی شکل میں منظم ہیں اور ساہا سال سے منظم نئی آرہی ہیں یہاں یہ حال ہے کہ مسلم لیگ اپنے گناہوں اور اپنی کوتاہیوں کی برکت سے وہم برہم ہو چکی، اس کی جگہ مینے کے لیے طالع آزما عناصر کسی اصول و مقصد اور کردار کے بغیر گونا گوں گولیاں بنا کر اُسٹے نین عوام کو یہ اپنی طرف جذب کرنے میں ناکام رہے۔ خود تو ناکام رہے، لیکن اس کے ساتھ انہوں نے اپنا پورا انداز پر صرف کر دیا کہ لوگ اگر ان کے ساتھ نہیں آ رہے تو کسی دوسری بہتر تنظیم سے بھی نہ بڑنے پائیں۔ یہ عناصر قوم کو ایک مستقل پریشانی و انتشار میں ڈال دیتے پرتل گئے۔ اب دیکھ لیجئے کہ نتیجہ کیا ہے۔
اب وقت پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ہر شخص چونکے اور اپنے آپ کو کسی منظم طاقت سے ملحق کرے۔ اپنے نصب العین کو سامنے رکھ کر دیکھیے کہ اس کے تقاضے موجود تنظیموں میں سے کس کے ساتھ ہو کر پورے کیے جاسکتے ہیں۔ پھر جس پر دل ٹھکے اپنے آپ کو اس کے شیرازہ میں پرو دیکھیے۔
نصب العین اسلامی ہے تو جماعت اسلامی ایک مضبوط مرکز (NUCLEUS) کی حیثیت میں سامنے موجود ہے اور قوم کے اجتماعی رجحانات کا اشارہ اب اسی طرف ہے۔ اس سے بہتر کوئی اور منظم و کھلی دے تو اس سے ہٹنے۔ نصب العین کوئی دوسرا ہو تو اس کے مطابق کوئی دوسری موزوں تنظیم وجود میں آئے۔
موجود تنظیموں میں سے کسی کے ساتھ ہم آہنگی (COMPROMISE) ممکن نہ ہو تو ہم اللہ کسی نئی تنظیم کی نیوٹو ایسے بہر حال اب اس حالت انتشار کو ختم ہونا چاہیے جو ایسے احوال کو پیدا ہونے کا موجب دیتی ہے کہ جن کے ہاتھوں نہ ہماری آزادی سلامت رہ سکتی ہے۔ نہ ہمارے تعمیری منصوبوں اور ترقی کے عزائم کی خیر ہے۔

کوئی تنظیمی طاقت بغیر ایک موزوں لیڈر شپ کے نہیں اُبھر سکتی اور وجود پذیر ہو جی جاسے تو کبھی ایک فعال طاقت نہیں بن سکتی۔ نصب العین اگر تنظیم کا تقاضا کرتا ہے تو تنظیم کو صاحب صلاحیت قائد مانگتی ہے۔ جیسے ایک آزاد سلطنت کے حصول کا نصب العین جب قوم نے اپنا یا تو اس نے مسلم لیگ کی تنظیم کے تحت اپنے آپ کو سمیٹا اور قائد اعظم کی شخصیت کو رہنمائی کے منصب پر رکھا۔ اسی طرح اب اگر اسلامی آئیڈیالوجی پر معاشرہ کی تعمیر نو کا نصب العین قرار پایا ہے تو اس کے حصول کے لیے جہاں کسی موزوں نظام جماعت کا انتخاب ضروری ہے وہاں دوسری ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ یہ کام جس طرح کا لیڈر مانگتا ہے وہ دستیاب ہو۔

قوموں کی امامت اور سلطنتوں اور معاشرہ کی تعمیر و ترقی کا کام جس نوعیت کا لیڈر مانگتا ہے اس کی پہچان یہ نہیں ہوتی کہ وہ بڑی چابکدستی سے کسی عہدے پر جا بیٹھا ہے۔ اس نے کسی انتخاب میں حریفوں کو پچھاڑ کر اسمبلی کی نشست جیت لی تھی، اس نے کوئی پیرج بننا دیا ہے یا بجلی اور شوگر کا کوئی کارخانہ کھلوادیا ہے۔ یا وہ کوئی بڑی برادری اور جاگیر رکھتا ہے۔ قوموں کو بنانے والے لیڈروں میں دیکھنے کے پہلو یہ ہوتے ہیں کہ کیا وہ کوئی جامع اصول و نظریہ اپنے ساتھ رکھتا ہے، کوئی قابل عمل پروگرام اس کے پیش نظر ہے، مضبوط کیریئر اس میں پایا جاتا ہے، ثبات اور استقلال ہے قربانی دینے کا حوصلہ ہے، ریاست و امامت اور بے لوثی کی عظمت ہے، اس معیار کا پرچم سے کر ڈھونڈیے کہ آیا آپ کے آٹھ کروڑ افراد میں اس صلاحیت کا کوئی اکاؤنڈا فرد باقی آسکتا ہے سونیا کی کوئی پست سے پست قوم شاید اتنی گئی گزری نہ ہوگی کہ وہ اپنے اجتماعی نصب العین کی طرف اقدام کرنے کے لیے اپنی مزدورت کا کوئی لیڈر نہ پاسکے۔ اسنے گئے گزیرے یقیناً ہم نہیں ہیں لیکن مشکل جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ اگر اللہ کا کوئی بندہ اس مترقع پارٹ کا ادا کرنے والا ہے بھی تو آپ کا یہ پریس آپ کے یہ لیڈر اور آپ کے بعض اکابر تک ہر ممکن تدبیر کے ذریعے اس کو شناس میں معزز ہے کہ قوم کسی ایسے شخص تک پہنچے اید اس سے اپنے آپ کو روک نہ کہنے پاسد۔

آپ کا ہمایہ قوم کو جن چیزوں نے سابقہ حیات میں آگے کر دیا ہے ان میں سے ایک یہ تھی

کہ شروع سے اس نے ایک لیڈر کا ذہن تھا، اور اس کے گرد سمٹ گئی۔ گاندھی جی سے ان کے فلسفے اور ان کے سیاسی طرز کار میں اگر ایک ایک جزئی اختلاف پر مختلف عناصر مخالفتیں برپا کیے رہتے، ہر ذہین آدمی ان سے حریفانہ اندر رقیبانہ معاملہ کرتا اور پریس اور شروع سے ان کا بائیکاٹ کرتا اور ان کا منہ بند اڑاتا رہتا تو گاندھی جی قومی لیڈری کی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود قومی ہیرو نہ ہوتے، مگر دوسری طرف قوم بھی اس سطح پر نہ پہنچ پاتی جس پر وہ آج ہے۔ اس ہمسایہ قوم کے بخلاف مسلمانوں کی یہ ایک مستقل کمزوری رہی ہے کہ وہ کسی ایک قیادت پر ٹھننے پر تیار نہیں ہوتے اور ان کا ہر ذہین آدمی اس جہاد میں لگا رہتا ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا شخص قومی قیادت کا مقام حاصل نہ کرنے پائے۔ قوم صرف ایک مرتبہ تاؤ اعظم کے ساتھ جمع ہوئی اور اس کے نتیجے میں اسے پاکستان حاصل ہو گیا۔ اب وہ اپنی پرانی عادت کے مطابق پھر منتشر ہے تو اس کا حال یہ ہے کہ کچھ نئی جدوجہد میں جو کچھ کیا تھا اس کی حفاظت بھی مشکل ہو رہی ہے۔

اب اگر زندہ رہنا ہے تو ہمیں اس کمزوری کو دور کرنا ہو گا اور وقت متنہہ کر رہا ہے کہ اس کمزوری کو برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھنا تو درکنار، اندیشہ ہے کہ فطرت کے بے لاگ قوانین آپ کو اٹھا کر اور پیچھے نہ پھینک دیں۔ موجودہ حالت انتشار اگر قائم رہے تو کسی نجات دہندہ قوت کی سیجائی اور کسی محافظ قوم کی پاسبانی پاکستان کو خطرات سے نکل نہیں سکتی، لیکن اگر اس حالت انتشار کی دلیل سے نکلنے کی عملی تدابیر خود قوم اختیار کر لے تو پھر امریت پسند اور جاہ طلب حضرات کی ہبک سے ہبک وقتی کارروائیوں کے تنازع کا سدباب کیا جاسکتا ہے۔ تباہ استحکام اور ترقی کے لیے اپنی خودی ضروریات کو پھر ذہن نشین کر لیجیے۔ ایک جامع تعمیری نصب العین — ایک مضبوط اصولی تنظیم — ایک صاحب کردار لیڈر!